

”سرپرینڈر۔“ ای چند ایں۔

”ای آپ کو سرپرینڈر باد نہیں ہے، وہ جو میرا دوست تھا۔“

”اچھا سرپرینڈر آتے اس بخت مارے نے کن دنوں میں خط لکھا ہے۔“

”ای“ اس نے کچھ سوچیے ہوئے پوچھا ”روپ انگریز میں اب کیا کوئی نہیں ہے؟“

ای نے اسے غور سرپرینڈر بیٹھے بیٹھے بیٹھے بیٹھے کا خیال آیا ہے؛ وہاں اب

کون بیٹھا ہے۔ ہم تو بہلے ہی آگئے تھے۔ بنوں رہ کئی حقیقی، پھر وہ بھی بیٹھی کے ساتھ ڈھاکہ

چلی، کیتی۔“

”مگر صابرہ۔“

”صابرہ کا نام میرے سامنے ملتے،“ ای نے غصہ سے کہا۔

”کیوں؟ وہ می کامنہ بکھر رکا۔“

”وہ تو بہت ہی خود سر لڑکی نکلی،“ ای نے وضاحت کی ”اوں تو میں پوچھوں ہوں کہ جب سارا خاندان ہی وہاں سے چلا آیا تو وہ وہاں کیوں رکی۔ اسے وہاں آجائی تو اس کا کوئی نہ کوئی ٹھکانا ہو، ہی جاتا۔ خاندان ہی میں کہیں کھپ جاتی۔ وہاں کنواری بیٹھی ہے۔ اور کوئی کھاری ہے۔ اچھا خیر الگ وہاں سبھی حقیقی توجیہی کا کچھ خیال رکھتی۔ بنوں نے اسے کتنی تاکید کی تھی، میں نے بھی اسے خط لکھا کہ بیٹھی حرم کے دس دنوں کے لئے وہاں کا ایک پھررا گالیا کہ کہ امام بالائے میں چراغ جل جایا کرے اور علم کھڑے ہو جایا کریں، مگر اس خدا کی تبدی نے وہاں ایک درجہ چوڑا کے جہاز کا ہوا۔ آخر کوئی نہ تھا حقیقی وہاں ہے کے بیٹھے گئے۔ اب ملے گا اسے چند کا ورنہ وہ اکیلی گھر کی ماں۔ یوں وہاں سے کون حصہ ٹھانے جا رہا تھا۔“

”ای ہم وہاں جائیں تو ٹھہریں گے کہاں؟“

”لڑکے تیرا داعنچل گیا ہے، وہاں اب ہم کیوں جائیں گے۔ وہاں ہمارا کون بیٹھا ہے؟“

”خود روپ نکر تو ہے۔“ اس نے سوچتے ہوئے آہستہ سے کہا اور ای جیسے لا جواب ہو گئی۔

ہوں، بالکل چب ہو گیں۔

”ای تو چب ہو گئی تھیں، لگہ پھر انہیں کچھ خیال آگی رکھنے لگیں“ آئے رات میں نے عجیب خواب دیکھا۔ جیسے ہم وہاں کے ہیں جیسے سب ہیں، میں بتول سے کہہ رہی ہوں کہ ہیں تو تو گھر کو بالکل کھلا پھوٹ رکھتی۔ پھلا دیکھو بھرا گھر اور کسی ایک کمرے میں تالا نہیں ہے۔ ای چب ہو گیں پھر طبریہ ایں ”پتا نہیں اس کی کیا تیری ہے۔ تیر سے باپ سے بچوں کی کیسا خواب ہے۔“ ای چب ہو گیں اور سوچ ہیں ڈوب گیں۔ ان کے ساتھ ساتھ وہ بھی کسی دور کے دھیان میں گھوگی۔ لکھنے زما نے بعد ایاں بیٹا اکٹھے بیٹھے دھیان کی ایک ہی لہر میں رہے رکھے۔ انہیں ہما کہ کھاں سے کھاں سے کئی بھتی۔ اس آن وہ یہاں کھاں رکھے۔ روپ نگر کے اپنی حوصلی میں مجھلک رہے رکھے۔

اباجان اس آن جلنے کھاں سے آن درآمد ہوتے۔ ماں بیٹے کو گم سرم دیکھ کر کسی قدر حیران ہوتے۔

”ذاکرہ! کیوں کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں ابا جان۔“ آہستہ سے کھا اور چب ہو گیا۔

پھر انہوں نے بیوی کی طرف دیکھا ”بات کیا ہے؟“

”بات تو کچھ بھی نہیں، بس بونتی بھیلی بالتوں کا خیال آگی تھا۔“ ایک اسلیے مظہر سے اس کے ساتھ وہ روپ نگر کے سفر سے والپس کریں۔ والپس پر انہیں اس پھوٹے سے کہائے کے گھر کے درودیوار لکھنے عجیب اور اجنبی نظر آتے۔ مخنوٹی دیر کرنے والے چھرمگ ہو گیں۔ پھر اچانک بولیں ”احی، میں نے لہاک کو ٹھری کے تالے کی چانی کھاں ہے؟“

”کو ٹھری؟ کون سی کو ٹھری؟“

”اسے ہے ابھی سے بھول گئے۔ اپنی حوصلی میں کو ٹھری نہیں بھتی؟“

”اپھا حوصلی کی کو ٹھری۔“ ابا جان چب ہوتے، پھر اسے ”ذاکرہ کی ماں پچھیں برس

گھنر پچے ہیں۔“

«اجی میں تے کوھٹری کی چابی کو پوچھا ہے، برسوں کا حساب نہیں پوچھا۔»

«تم نے کوھٹری کی چابی کو پوچھا تو میں نے ہوچا کہ نہیں یہ بتا دوں کہ کتنا زمانہ گزر

چکلہ ہے۔»

«اجی زمانے کا کیا ہے وہ تو گزرتا ہی رہتا ہے مگر کوھٹری کی چابی کھو گئی تو غصب ہو جاوے گا۔ ہماری تو ساری چدی پیٹتی چیزیں اسی میں بندیں ہیں۔ میرا سارا جمیٹر کا سامان اسی میں ہے اور اللہ رکھے جب ذاکر پیدا ہوا تھا تو داد نے پوتا ہونے کی خوشی میں چاندی کی رکابیوں میں بالوشہ سیں بیادری میں بانٹی تھیں۔ اس وقت کی بچی ہوتی بارہ رکابیں بھی وہیں رکھی ہیں اور ہاں تم قتے جو کمر بلاتے معلانی سے کفن منگایا تھا وہ بھی وہیں اسی لڑک میں رکھا ہے جس میں پڑتے ابا کی مدینہ منورہ والی جانمازا اور خاک شناگی سجدہ گاہ رکھی ہے اور بڑی اماں کی پیاری اور رخل رکھی ہے۔»

«کفن؟، اس نے تیج سے امی کو دیکھا۔

«ہاں پیٹتے کفن تیج سے دادا کمبلی کی زیارت سے آتے تھے تو وہ کفن خاص وہاں کے پیار کئے ہوتے اور نام کے روشنی سے مس کئے ہوتے اپنے سامنے لاتے تھے۔ ایک میں تو خود دفن ہوتے اسے جب ہی تو ان کی قبر سے چالیس دن بعد مشک کی سی خوبیوں آتی رہی تھی۔»

«چالیس دن؟ تم چالیس دن کی بات کہ رہی ہو، میں تو یہ چانتا ہوں کہ جب بھی میں نے وہاں جا کے فائخ بڑھی تجھے یہ محسوس ہوا کہ قبر سے خوبیوں تکل رہی ہے۔ عجیب ہی طرح کی خوبیوں ہوتی تھی۔، اب اجانب چپ ہوتے پھر مٹھٹا ساسن بھر کے بولے «اللہ ہبڑ جانتا ہے کہ وہ سب قبر بن کس سال میں ہیں۔»

«میں یو کہ سکتی ہیں وہ تو میں نے کہ دیا، ویساں پورے لئے جب، ہم چلے ہیں تو اسی وقت،

میں نے جدی پشتو شباہیاں کو محضی میں سمجھوادتی تھیں اور تالاٹاں دیا تھا اور میں نے پاکستان چلنے سے پہلے بار بار نہ سے کہا کہ میں روپ نگر کا ایک پھیبیں لگا آؤں اور جو چیزوں ہائے یعنی ہوئے ہوں، مگر تم نے میری ایک نہ سنی۔ ارسے میں ایک مرتبہ تالاکھوں کے چیزوں کو کم سے کم دھوپ تو رکا آتی۔ انداز ماہنہ ہو گیا بخخت دیمک نہ لگ گئی ہو، اس لکھر میں دیمک بہت بخختی۔

مجھے جانا چاہیے پیشتر اس سچھے کہ دیمک سب سیکھ چاٹ جاتے۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ پھر اس کے ذہن میں سوال اٹھا کہ آخر وقت کے ساتھ چیزوں کو دیمک کیوں لگ جاتی ہے۔ وقت اور دیمک کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ وقت دیمک ہے یا دیمک وقت ہے؟ «ذا کمرکی ماں! تمہیں یاد ہمیں کہ اس وقت گاٹاں بیوں میں کیا ہو رہا تھا۔ میں تو خود چاہتا تھا کہ چلنے سے پہلے روپ نگر کا ایک پھیبیں لگا لوں بینز گوں کی قبروں پر اخڑی فاتحہ تو پڑھ لی ہوتی، اب اجھا رکے، پھر لوئے اور کم از کم اپنا کفن تو لے آئتا۔» رکے اور اس سے مغل طب ہوتے۔ بیٹھے وہاں تو ہم نے اپنے کفن دفن کا اسرا انتظام کر لکھا تھا۔ کفن آیا رکھا تھا، قبر کی جگہ بھی طے کر لی تھی۔ بیس عزیزوں کو اتنی زحمت کرنی پڑتی کہ بیری کی چار ہمیں اون تو رکے ہمیں غسل دے دیں۔ اور کامزہا دے کہ قبر میں اتار دیں۔ لگیہ یہاں کوئی انتظام نہیں ہے۔ سب انتظام تمہیں کہنا ہے۔»

مسلمانوں کی تہذیب میں قبر کرتی بڑی طاقت ہے۔ اسے سرپندر کے خط کا ففرہ یاد آگیا۔

« اس سے مجھے تو ہی فکر کھلتے جا رہی ہے کہ ہمارا منہا کیسے ہو گا، اسی فکر میں انتہا لجھے میں پولیں زندگی تو جیسے تیسے کمزور تھی، مگر مرنے پر تو سوا انتظام کرنے ہوتے ہیں، تو گویا موت زندگی سے زیادہ انتظام چاہتی ہے اس نے دل میں سوچا۔ دروازے پر دفتار استنک ہوئی۔

”کون؟“

”میں عرفان“

”آیا۔“ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف چلا۔  
امی تو فوراً ہی کمرے سے نکل گئیں، مگر اب اجانتے عرفان کے آنے کا انتظار کیا۔ اس  
کے داخل ہوتے ہی سوال جڑ دیا۔ ”میاں! کوئی خبر؟“

”رجحی کوئی خاص خبر تو ہے نہیں۔“

”میاں تم کیسے اخبار نویں ہو؟“ رک کر بولے ”لگہ تمہاری بھی کیا خاطل ہے، آج کل  
اخباروں کا حال ہی ایسا ہے آگے خبروں کو اچھا لائکھتے تھے، اب خبروں چھپاتے ہیں ہر جاری  
الشدر جنم ہی کیسے، حالات کچھ اچھے نظر نہیں آ رہے۔“ یہ کہتے کہتے اٹھے اور اندر پڑ گئے۔  
”یا را! میں تیرا انتظار کھٹا رہا، بہت بوریت رہی، شیراز تو آج بالکل خالی پڑا تھا۔“

”ادھرا کوئی نہیں آیا؟“

”بیس وہی سفید سر والا آدمی۔ آج اس نے مجھے اکیلا پاکے دبوچ لیا۔ بہت بور کیا،“ رکا،

”پھر لو لا! یا را مجھے یہ آدمی بہت مشکوک نظر آتا ہے۔“

”یہ بات تم پہلے بھی کہہ چکے ہو۔“

”لگہ آج مجھے یقین ہو گیا ہے۔“

”کیسے؟“

”یا را! جو شخص قومی درد کا بہت ظاہر کر رہے اس کے بارے میں مجھے خواہ خواہ نہ کہا ہوتے۔“

”لگتا ہے۔“

”چھوڑ! یا راس قصے کو۔ تجھے ایک خبر سناؤ۔“

”ادھرا سنا۔“

”ریا را آج ایک خط آیا ہے،“ اس نے راز دالت انجامیں کہا۔

”کہاں سے؟“

”ہندوستان سے۔“

”ہندوستان سے؟“ عرفان نے اسے سر سے پیڑک شک بھری لٹکوں سے دیکھا ”ہندوستان سے خط؟ اس زمانے میں ہے کسی عزیز کا ہے۔“

”نہیں، اپنے پرانے دوست سریندر کا۔“

”سریندر کا خط اس زمانے میں ہے؟“ عرفان نے طنز بھرے لمحے میں کہا ”یار ذاکر، مجھے کبھی کبھی تجھ پر بھی شک ہونے لگتا ہے۔“

”میں نے خود اپنے بارے میں اکثر شک کیا ہے۔ مگر غیر فی الحال تو اس خط کو پڑھ۔“ اس نے خط عرفان کے حوالے کیا۔

عرفان نے شروع سے آخر کا انتبا ط سے پڑھا۔ وہ خط پر ٹھوڑا تھا اور ذاکر اس کے پھرے کے اُتار چڑھا و سے اس کے رد عمل کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خط پر ٹھوڑا چکنے کے بعد عرفان ہنسنا ”یار میں سمجھتا تھا کہ صابرہ تمہارے نواسا بیجا زدہ تخلیل کا فتور ہے۔ مگر وہ تو بچ نہ دیور رکھتی ہے۔“ رکا، پھر لولا ”یہ حال تمہارے عشق کی  $TIMING$  سوچ ہے۔ عشق کا پھل کس موسم میں آگئ پکا ہے۔“

اس نے عرفان کے لیاں کو نظر انداز کیا اور کہنے لگا ”یار میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔“

”کیا کہا؟ جانا چاہتے ہو۔“

”ہاں بار ابھی چاہتا ہے کہ ایک مرتبہ جا کر ملا جلتے، اس سے پہلے کہ۔۔۔“ وہ کچھ کہتے رک گیا۔

”اس سے پہلے کہ۔۔۔“ عرفان نے ایک طنز کے لمحے میں اس کے کہے ہوئے لفظ درہرائے پھر لولا ”مرتب عزیز ا وقت بہت گزر چکا ہے۔“

”ہاں وقت بہت گزر چکا ہے، مگر پھر بھی۔۔۔“ کہتے کہتے وہ سوچ میں پڑ گیا۔

اپنے کمر سے میں جھانکا درسے بلیٹا اب یہ باہر شور کیسا نئی رہا ہے۔  
”شور ہے کیسا شور؟“

”کہہ رہے ہیں کہ جنگ شروع ہو گئی؟“  
”کیا؟ جنگ شروع ہو گئی؟“ دونوں ایک دم سے اٹھ کھڑے ہوتے اور تیزی سے  
باہر نکلے۔

ایشام بھتی اور گلی میں اس طرف سے اُس طرف تاک اندر چلا۔ دور کے کئی مکانوں کے  
دریچوں اور روشنِ دالوں سے روشنی چمن کر کر آ رہی تھی۔ گمراخند ہیں گلی میں ایک شور اٹھ رہا تھا کہ  
دیکھ لیں گل کرو، لاتست، آفت کر دو، اور گھروں کی روشنیاں گل ہوتی چل گئیں۔ اب دورِ دوزہ ک  
پورا اندر چلا رضا گار فوجوں کی ایک لوئی سیلیاں بھاتی تیزی سے گلی میں داخل ہوئی۔ ذاکر اگے  
بڑھا رکھا بات ہے بھتی۔“

”جنگ شروع ہو گئی؟“

”کون کہتا ہے۔“

”ریڈیو سے اعلان ہوا ہے۔“ اور ٹوپی سیلیاں بھاتی ہوتی تیزی سے دوسرا گلی میں  
مرٹکی۔

وہ دونوں تھوڑی دیر تک چپ کھڑے رہے۔ پھر وہ اپنے گھر کی ڈیوری پر بیٹھے ہوتے  
بولا دیا رجنگ تو واقعی شروع ہو گئی۔“

”ہوں،“ عرفان سوچتے ہوتے بولا اور اس کے پر اپنے بینہ ٹیکا۔

دونوں دیر تک اس کے داؤ دودڑیوڑھی پہ بیٹھے رہے۔ اندر گلی میں دوسرا کت  
ساتھ۔

یکا یک، سائمن بھنا شروع ہو گیا اور اس کے ساتھ قریب و دور سے سیلیوں کی تیز اوازیں  
آنی شروع ہو گئیں۔ سیلیوں کی آوازیں اور بھلنے دوڑتے قدموں کی چاپ۔

« اندر نہ چلے چلیں؟ ॥ اس لئے آئشہ سے کہا۔

« اندر بہت خنوظ ہے؟ ॥ عرفان نے ناخوشگار سے لمحے میں پوچھا۔

« تمہیں۔ ॥

« تو پھر؟ ॥

سائز ان کی آواز رفتہ رفتہ معدوم ہو گئی۔ بھلگتے دوڑتے قدموں کی چاپ، سیٹیوں کی آواز، لوگوں کی پیخ و پکار، دلاتٹ آف کرو، کی غصیلی ہلکات، رفتہ رفتہ سب آوازیں خاموش ہو گئیں، فضایاں سنالا چھا کیا۔ مکان اس ستائی میں کوئی بڑی آواز سننے کے منتظر تھے۔ دینک منتظر ہے، کوئی بڑی آواز، کوئی دھماکہ سنائی نہیں دیا۔

« بیارا! ॥

« ہوں! ॥

« بیاریں سوچ رہا ہوں کہ صابرہ۔ ॥

« تو تم صابرہ کے متعلق سوچ رہے ہو؟ ॥

« ہاں! ॥

« اس وقت؟ ॥

« ہاں اس وقت۔ ॥

دور سے آئی ہوئی ایک گھون گھون کی مدھم آواز نے انہیں خاموش کر دیا۔ وہ پھر گوش باؤاند بسو گئے۔

وہ بہمندوستان کے جماز ہیں؟ ॥

« ہاں بہمندوستان کے جماز سے آج تمہیں محبت نامہ موصول ہوا ہے۔ ॥

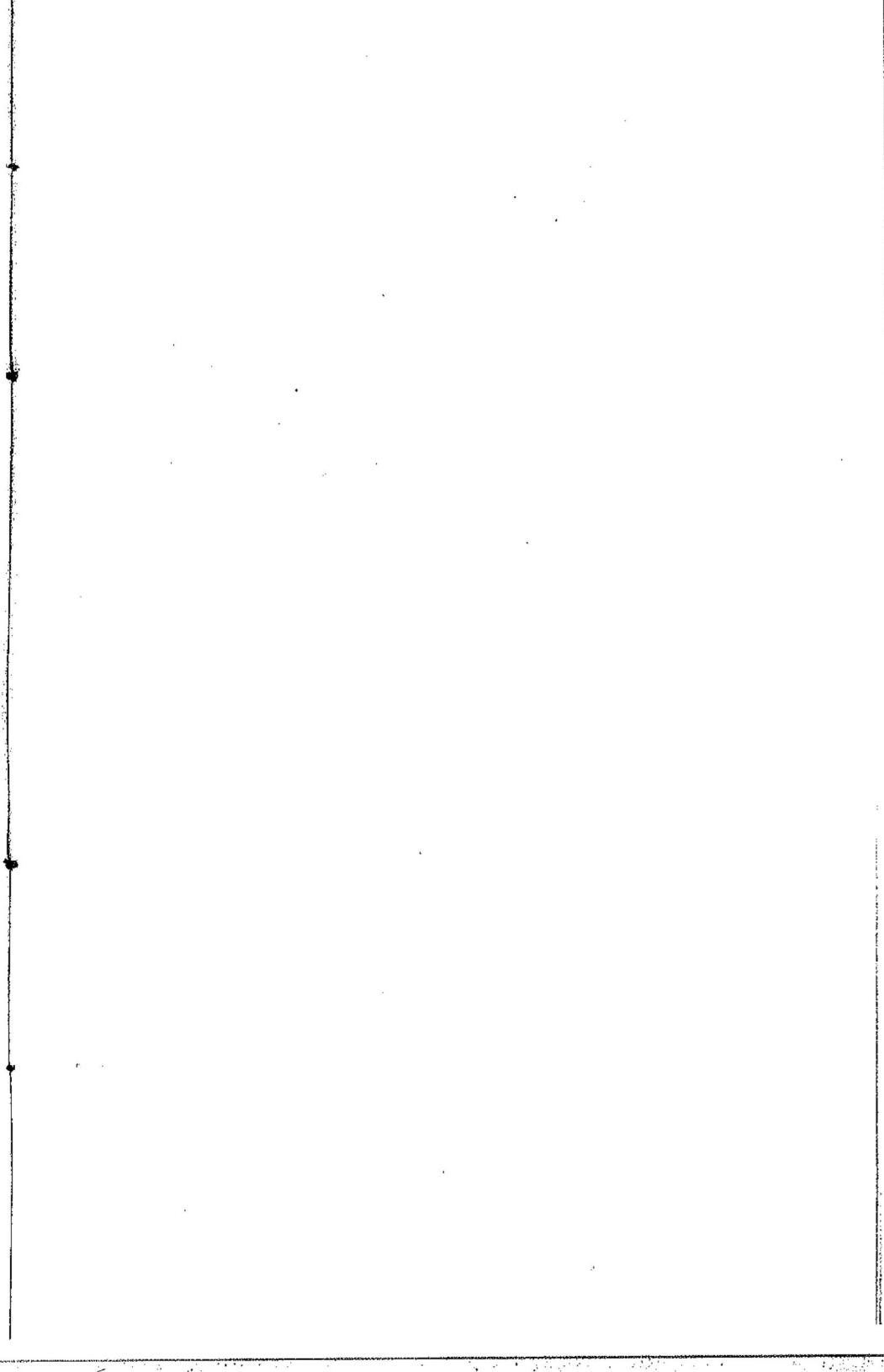
وہ مجھے باریں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ ॥

« کیا؟ ॥

”بہ کہ اب صابرہ ڈھاکہ کو بھول کر اس شہر کی خیریں معلوم کرہ تی پھر سے گی۔“

”سلو،“ عرفان نے تشویش پھر سے بچے سے سرگوشی میں کما اور دونوں پھر گوش براؤاند ہو گئے، جیسے دور پر سے کسی انجانی بستی میں گولہ گرد ہو۔ اور پھر اتحاہ خاموشی، ایک خوف بھرا سناٹا۔ پورا شہر جیسے سانس روک کے ساکت ہو گیا تھا۔

---



موریں، نیکیاں، رکشا میں، تالگوے سب سواریاں عجلت میں تھیں کہ ایک دوسرے پر چڑھی جا رہی تھیں۔ اسے سڑک عبور کرنا دشوار نظر آرہا تھا۔ سواریوں کو دیکھا، دقتاً ایک کار کے اس کی پشت پر اسے سڑک عبور کرنا دشوار نظر آرہا تھا۔ سواریوں سے بھری، سامان سے لدی فراٹے کے ساتھ اس کے روابر سے گزری جلی گئی۔ کار کی پشت پر لکھا ہوا الفہر و زادیہ کے لئے اس کی نظروں کے سامنے آیا اور پھر اڑائی گرد میں دھنڈ لایا۔ کار بہت تیزی میں بھی کہ سڑک سے اٹکنے کے میں آئی اور گرد اڑاتی الٹی چل گئی۔

اس نے گزرتے طریقہ کا اب تفضیل سے جائزہ لیا۔ کاریں اور نیکیاں اپنی چمک دکھ کھو بیٹھی تھیں۔ ان کے ڈھایخوں پر مٹی لپی ہوتی تھی۔ ہر کار، ہر سڑکی سواریوں سے بھری ہوتی، سامان سے لدی ہوتی۔ تالگوں میں سامان اور سواریاں ایک دوسرے میں گڑھتے۔ یا اللہ! یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ اپنی اس حیرانی کا ذکر اس نے شیراز پنج کہ عرفان سے کیا "یا را" آج ہماری سڑک پر بہت طریقہ تھا۔ سڑک عبور کرنا مشکل ہو گیا۔ لوگ آخر کہاں جا رہے ہیں؟" تم تے صرف سڑک کا طریقہ دیکھا ہے۔ میں ابھی اسٹیشن کا نقشہ دیکھ کے آرہا ہوں۔" "وہ نقشہ بھی بتا دو۔"

"مت پوچھو۔ پیٹ فارم پر اتنا سافر ہے کہ وہاں سائنس لینا مشکل ہے اور گاڑی کوئی نہیں، اکرہ نہیں۔ پس قیامت کا سماں ہے۔"

”اور یہاں شیراز خالی پڑا ہے۔“ اس نے اردوگر دنظر ڈالتے ہوئے کہا۔ آج شیراز بالکل ہسی خالی تھا۔ وہ اور عرفان بیس دو دم ایک میز کے گرد بیٹھتے تھے۔ ”یار آج وہ اپنا دوست سید بالوں والا بھی نہیں آیا۔“

اچانک صوانہ کھلا اور افضل داخل ہوا۔ اردوگر دنظر ڈالی ”خالی؟“

”خالی۔“ اس نے افسر دیگی سے جواب دیا۔

”بیو ہے کہاں چلے گئے؟“

”تمہاری بائسری کا انظر کر کر کے اتنے FRUST RATE ہوئے کہ خود ہی سمندر کی طرف چلے گئے۔“ عرفان نے طنز بھر سے لمحے میں جوایہ دیا۔

افضل نے گھوڑے کے عرفان کو دیکھا۔ لیسی گھسیٹ کہہ بلیٹھتے ہوتے بولا:

”کبڑوہ آدمی بچاتے مڑکا۔“

”عیندی!“ عرفان نے آواز دی۔

عیندی جائیے آرڈر کا منتظر ہی تھا، فوراً لپک، کہا کیا ”ہاں جی!“  
”تھے۔“

افضل سوچتے ہوئے بولا:

”یا پرندے پرست پریشان ہیں۔ میں ابھی ابھی راوی کی طرف سے آمد ہوں۔ جب بھماز آتے ہیں تو اس پاس کے باعنوں سے پرندے حواس باختہ اڑتے ہیں یہ معنی طور پر آسمان پر چکر کاٹتے ہیں اور غریب پھر درختوں میں چھپ جلتے ہیں۔“

”رکا، بڑا بڑا!“

”در اس شہر کے پرندے پریشان ہیں۔“

”اور تم!“ عرفان نے اسے گھوڑے کے دیکھا۔

”میں بھی پریشان ہوں۔“

”تمہیں پتہ تھیں کہ جو پریشان ہیں وہ شہر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔“

**افضال سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کہنے کا:**

”ایک سافرنے کسی جنگل سے گزرتے گزرتے دیکھا کہ ایک چندن کے سڑیں آگ لگی ہوتی ہے۔ شاخوں پر بیٹھے ہوتے نہ مددے اُڑ پکے ہیں، مگر ایک راج ہنس شاخ پر جما بیٹھا ہے۔ سافرنے پوچھا کہ اسے راج ہنس کیا تو دیکھ نہیں رہا کہ چندن میں آگ لگی ہوتی ہے؟ پھر تو یہاں سے اٹا کیوں نہیں؟ کیا سمجھے اپنی جان پساری نہیں؟ ہنس لواکہ اے سافر! میں سے اس چندن کی جھاؤں میں بہت سکھ پایا ہے۔ کیا یہ اچھا لگتا ہے کہ اب جس کہ وہ وکھ میں ہے، میں اسے چھوڑ کے چلا جاؤں؟“

**افضال چپ ہو گیا، پھر بولا:**

”جانستے ہو وہ کون تھا؟—شاکرہ منی نے جانک ستائی، بھکشوؤں کو دیکھا کہ ہے بھکشوؤں! جانتے ہو وہ راج ہنس کون تھا؟ وہ راج ہنس میں تھا۔“

”اچھا!“ عرفان طنزیہ لجئے میں بولا:

”میں تم سے بھی اسی اعلان کی توقع کر رہا تھا۔“

**افضال عرفان کامنہ مکنے لگا، پھر بولا:**

”تو مجھیک کہتا ہے۔ بالکل ٹھیک۔ وہ راج ہنس میں تھا۔“

وہ اُنھوں کھڑا ہوا، دروازے تک گیا مگر کچھ سوچ کر پھر بیٹھا۔ عرفان کے قریب آیا، بولا:

”بدھ بھی سچا تھا، میں بھی سچا ہوں۔ اصل میں وکھلے جنم میں ہم دونوں ایک تھے۔“

**افضال پڑت کہ جانے لگا تھا کہ عیدل چاۓ سے لے کر آگیا۔ عرفان بولا:**

”چلائے آگئی ہے۔“

افضال نے عرفان کو مشققانہ تظر سے دیکھا۔ «عرفان! تو اچھا آدمی ہے۔»

افضال پڑھ گیا۔ عرفان نے چائے بنائی۔ افضال چلتے پہنچتے بولا:

«بیمار ہو کچھ ہوا اپچھا ہوا۔»

«لیکا اپچھا ہوا؟»

«بھی کہ مکروہ لوگ شہر چھوڑ رہے ہیں۔ شیراز آج کتنا پاکیزہ نظر آرہا ہے، رکا اور بولا:

«یار میں نے بہت سوچا۔ آخر اس تجھے پہنچا کر وہ لوگ یو طیب ہیں، اس لئک  
کو پہنچاسکتے ہیں۔»

«وہ کہاں ہیں؟» عرفان نے اپنے خصوصی لفڑی لے جیں پوچھا۔

«کہاں ہیں؟ کاسکے تجھے وہ نظر نہیں آتے ہیں اور تم اور فیکر بیار میں ہست، ہوتے ہیں؟»

پھر جیب سے نوٹ بک نکالی، قلم کھولا، نوٹ بک کھول کر کچھ لکھتے ہوئے بولا:

«عرفان! میں تجھے معاف کر دیا۔ طیب لوگوں کی فہرست میں تیرانا نام شامل  
کر لیا ہے۔»

پھر لڑکا بڑا یا:

«میری نوٹ بک میں طیب لوگوں کی فہرست روز بہرہ و ز خنثی ہوتی چل جا رہی ہے۔»

اچانک سائنس نجیخانہ رکھا۔ اس کے ساتھ ہی سیٹیاں تیر تیر بچھنے لگیں۔ افضال اٹھ کھڑا ہوا،

«تجھے چلنا چاہیئے۔»

«یہ ہوائی جملے کا سائنس ہے۔ باہر مت نکلو، بلیٹھر ہو۔»

«ذرا کہا تو بہت ڈرا بوا ہے۔» رکا، بولا:

«کا کامست ڈر۔ آج داتا سے میری بات ہو گئی ہے۔ میں نے کہا کہ داتا میں بترے

شہر کو اپنی بناء میں لے لوں؟ کہا کے لے۔ سو یہ شہر اب میری پناہ میں ہے۔

«سے کچھ نہیں ہو گا۔»

یہ کہتے ہیں اور باہر نکل گیا۔

بس اسی طرح رات اور دن کی تیز کے بغیر و قفقے و قفسے سائنس بولنا، سائنس کے ساتھ سیٹیاں بجاتیں۔ بڑی نیک کے سپاہی اور رسول ڈلیفنس کے رضا کار سڑک سڑک سیٹیاں، بچا کے اور اشارة کے ہدایات دیتے نظر آتے۔ سڑک سڑک سواریوں کی رفتار اچانک تیز ہو جاتی، پھر دھمکی پڑتی چل جاتی کہ وہ سڑک سے اُتر کر درختوں کے سلسلے میں ٹھکلنا بناتی چل جاتیں۔ رفتہ رفتہ سڑکیں خالی ہو جاتیں اور صرف بڑی نیک کے سپاہی اور رضا کار سیٹیاں متبین دبانتے جہاں تھاں کھڑے دکھانی دیتے۔ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک سڑک خالی کنارے کنارے کھڑی ہوتی موڑاویں، رکشاویں، ٹیکسیوں اور سکو ٹروں کی بی بی قطار بڑی نیک کا سارا شور، شہر کی ساری آوازیں معطل، چار سو بے حرکتی اور خاموشی تیزی سے گزرتی ہوئی کوئی جیب اس سے ہر کتنی اور خاموشی کو توڑتے کی کو شتشش کرتی تھی۔ دم کے دم میں او جھل ہو جاتی۔ اس کے بعد خاموشی اور امنہ آتی، بے حرکتی اور گہری ہو جاتی اور وہ کبھی کسی سڑک کے کنارے درخت کے سامنے بیٹھ کر کبھی درختوں کے بچپن کسی کھاتی میں ابھی راگہر وں کھینچ پس رکھ کبھی شیزاد کے کسی گونٹے میں دیکھ کر کان کھڑے کرتا۔ اس اندرستے کے ساتھ کہا بھی ایک عجیب شور اٹھے گا اور فضلاً سکوت، درہم و پرہم ہو جاتے گا۔ تکمک کوئی سور شناہی نہ دیتا، نہ کوئی بڑا دھاکہ، نہ کوئی ابھی آواز۔ بس دوز سے آتی ہوئی ایک ملائم گھوٹوں گھوٹوں۔ اس کے بعد پھر کمل ناموشی اور پھر سائنس بولنا کہ اب اس کے بولنے کے ساتھ پچھپے ہوتے لوگ، کوئوں کھڑدیں نہ نکلتے اور رکشا نیک، سکو ٹرو موبیل میں، ٹیکسیاں ایک دم سے پورے شور کے ساتھ چل پڑتیں، ابھی فضا پر شور پڑتے اور بڑی نیک روایاں اور بھیلی، ہر آئی خاموشی۔ دم میں کتنی بارہ بیمیں ہرایا جاتا، مگر شام پڑتے سائنس دوسرے رنگ سے بجتا کہ اس کے ساتھ سواریوں کی رفتاریں اور پیادوں کی چال میں اچانک ایک درہمی پیدا ہو جاتی۔ رکنے کی بجائے ہر سواری بے تحاشا دوڑ پڑتے۔

دوڑ رہی ہے اور ہر پیدا دھماکم بھاگ چلا جا رہا ہے۔ لگنہر فتنہ شور دور ہوتا چلا جاتا خاموشی شام کے دھنڈ کے ساتھ پھیلیتی چلی جاتی اور رات کے سچھیتے سائے کے ساتھ مل کر پورے شہر پہ چھا جاتی۔ اس خاموشی سے فائدہ اٹھا کر کتنا اول رات میں بھونکنا شروع کر دیتے ہیں پھر لگتا کہ رات بہت گندرا جکل ہے۔ اتنی جلدی اتنی راستہ ہو گئی۔ لگر اس کے بعد رات پڑ جاتی اور گزد نے کا نام نہ لیتی۔ پھر اچانک سائنس بول پڑتا۔ پھر وہی سیٹیاں۔ اس کے ساتھ ہی کتنا ایک نئی توانائی کے ساتھ بھونکنا شروع کر دیتے۔ لگتا کہ سارے شہر کے کتنا ایک دم سے بھر جھری لکر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ سیٹیوں اور لگتوں کے بھونکنے کا شور اس کے حواس پہ چھاتا چلا جاتا بنتے ہیں۔ لیٹی لیٹی اسے لگتا کہ ساری فضماں مکروہ شور سے بھر گئی ہے۔ قریب پلنگ پر لیٹی ہوتے آباجان اہستہ سے اٹھ کر بیٹھ جاتے اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنا شروع کر دیتے۔ پھر اسی کروٹ لیتیں اور اٹھ کر بیٹھ جاتیں۔

«ذاکرہ میلے! جاگ رہے ہو؟»

«جی امی۔» اور وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا۔

اور اس کے بعد اسی دعا کے لئے دونوں ہاتھ اٹھاتیں:

«ریا الہی غیر»

آباجان منہ ہی متہیں عزیزی میں کچھ پڑھتے۔ کبھی ناد علی، کبھی آیتہ الکرہ سی۔ امی او پچی کا نپتی آواز میں دھانگتیں۔ جب سے جنگ شروع ہوئی ہے۔ اسی کی خواہش کے مطابق ہم ایک ہی کمرے میں سوتے ہیں۔ رات کے اندر ہی میں اپنے اپنے پلنگ پر بیٹھ ہوئے تین سائے آباجان آیتوں کا وردکر رہے ہیں۔ اسی دعا مانگ، رہی ہیں اور پہن خطرے کی اتنی راتیں گزارنے کے بعد بھی اپنے ذہن کو ایسے وقت میں مصروف رکھنے کے لئے کوئی صورت نہیں سورج سکتا ہوں۔

سناٹے میں کان کچھ سننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خاموشی کی تھوں سے ابھرتی ہوئی ایک

آواز، گھوں گھوں گھوں۔ دن میں یہ آواز کتنی مدھم ہوتی ہے۔ مگر اس وقت، یہ آواز کتنی تیز اور کتنی ہدیت بھری ہے۔ اچانک کہیں دور سے دھماکے کی آواز۔

”ڈاکھا!“

”بھی۔“

”بلیا! یہ تو ہم کی سی آواز ہے۔“

”بھی۔“

”کہاں گرا ہے؟“

بم کہاں گرا ہے؟ شر کے مختلف کوچے میرے تصور میں ابھرتے ہیں۔ میں اندازہ لٹکانے کی کوشش کرتا ہوں کہ دھماکے کی آواز کلش سمت سے آئی بھتی اولاد سمت میں کون کون سے ملے واقع ہیں۔ اب اجان اسی یکسوئی کے ساتھ آیات کا فرد کرنے میں مستغرق ہیں اور میرا ذہن شہر کے مختلف کوچوں میں بھیک رہا ہے۔ شام گدر میں اچانک ٹھٹھک جاتا ہوں اور شام گدر کا وہ مکان جس میں ہم نے پاکستان اگر پڑا تو ڈالا تھا، میرے تصور میں ابھر آتا ہے۔ کیا یہ بم وہاں گھمہ ہے؟ نہیں اسے وہاں نہیں گزنا چاہیئے۔ میری اس مکان سے کوئی چندیا تی والیستگی نہیں ہے۔ بس وہاں سے منتقل ہوتے ہی وہ مکان میرے دل و دماغ پر کوئی نقش پھوڑتے بغیر حافظے سے اٹھا گیا تھا۔ مگر اس وقت اچانک وہ مکان میرے تصور میں ابھر آیا ہے۔ وہ کہہ میری آنکھوں میں پھر رہا ہے جس میں میں نے پاکستان اگرہ پہلی رات پیسر کی تھی۔ نہیں، بم اس علاج میں نہیں گزنا چاہیئے۔ اس گھر کو عفو طریقہ پاہیزے، اس پورے گھر کو اراس کمرے کو کہ وہ پاکستان میں میری پہلی رات کے آنسوؤں کا ایمن ہے۔

۵۔ وسمبر:

جنگ کی راتوں میں اپنے ذہن کو ایک رستے پر رکا کے رکھنے کی تکمیل میں نے سوچ لی ہے اور اس پر عمل شروع کر دیا ہے۔ یعنی اس وقت جب باہر کہیں دور کتے جھوک ہے۔

میں ہیں لحاف، میں بیٹھا لا لیٹن سامنے رکھے ڈامنے کی لکھڑا ہوں۔

جاڑے کی راتیں بلی ہوتی ہیں، جنگل کی راتیں ان سے زیادہ لمبی ہوتی ہیں۔ ایک بھاڑے اور جنگل کے موسم ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ جنگل کا دن تو فتوحات کے مردے اور گستاخوں کی افواہیں سننے اور قیاس کے گھوڑے دوڑتے میں گزر جاتا ہے، رات یکسے گزداری جلتے؟ کرفیو کے وقت سے پہلے پہلے گھر آ جاتا ہوں، امی جان کی کوشش ہوتی ہے کہ بلیک آؤڑ، سے پہلے کھانپینے سے فراغت حاصل کر لی جاتے۔ یہی ہوتا بھی ہے۔ ہم بلیک آؤڑ سے پہلے کھانا کھایتے ہیں۔ پھر امی با ورقی خانہ بند کر کے الینان سے کمرے میں آبیٹھی ہیں۔ بس اس کے ساتھ ساتھ با ہرگلی بھیے قدموں کی آہٹی بند ہو جاتی ہے نہ قدموں کی آہٹ نہ پھوٹ کا شورو غل، نہ پھوٹ کو پکارتی ہوئی ماوں کی بیخ و پکار۔ بس ایک دم سے سناپا پر جاتا ہے۔ رضا کاروں کی سیٹیوں کی آواز بھی آنی بند ہو جاتی ہے۔ اچانک محلے کے ساتھ یا جماعت بھونکنا شروع کر دیتے ہیں۔ ابھیں دور کے محلوں کے کنوں سے اپنے اقدام کی تائید حاصل ہوتی چل جاتی ہے۔ رات کے اول وقت میں آدمی رات، کامان پیدا ہو جاتا ہے۔ ستاٹا، پھر سائز اور سیٹیاں، پھر کہیں دور آسمان پر اڑتے جمازوں کی بہت مدھم گھوٹکوں پھر سائز، پھر ستاٹا رات کمپتی چل جاتی ہے کسی طور ختم ہونے میں نہیں آتی۔

(ابی جان نے جنگ کی بیٹی راتوں کو گزندانے کا اچھا طریقہ سوچا ہے۔ مصلی! پچاکہ بنیظہ جاتے ہیں اور رات گئے ہم بیٹھے رہتے ہیں ان کی دیکھادیکھی امی جان نے بھی اپنی عشاکی نماز کو طول دینا شروع کر دیا ہے۔)

میری سمجھیں ان راتوں کو گزندانے کا طور نہیں آ رہا تھا۔ لا لیٹن کی روشنی میں کتاب نیادہ دریزناک پڑھنہیں سکتا۔ بھلی امی جان نہیں جلا تھے دیشیں۔ وہ بھی سمجھی ہیں۔ بھلی کی نیزروشنی کسی نہ کسی طور پر کہ باہر پہنچ جاتی ہے پھر رضا کار فل چاتے ہیں، لاست بند کرو، لاست بند کرو۔ اور لا لیٹن یوں مجھے اپنی لگتی ہے۔ لا لیٹنوں کے زمانے کو جب ہمارے روپ نگیں

ابھی بچل نہیں آئی تھی اور اندر گھر میں بھی اور باہر کلی میں بھی لا لٹین ہی کی روشنی ہوتی تھی، میں کس جبست سے یاد کرتا ہوں، بڑے ہو کر میں نے تعلیم کی ساری منزدیں بھی لا لٹین ہی کی روشنی میں طے کیں۔ مگر اب یہ حال ہے کہ لا لٹین کے رملے کو صرف یاد کر سکتا ہوں، لا لٹین کی روشنی میں کتاب نہیں پڑا سکتا۔ مگر میں نے آج بھر پر کیا ہے، لکھ سکتا ہوں۔

اس ڈالنگی کو لکھنے کا اولین مقصد تو یہی ہے کہ جنگ کی بلی راتوں میں میراذ ہن جب خواں کامیوق بن کر آوارہ بھلکتا پھرتا ہے اسے کسی رستے پر لگادیا جاتے اور پر اگنہ خیالی سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا جاتے۔ مگر اسی کے ساتھ اس میں مجھے ایک اور فائدہ بھی ظظر آ رہا ہے۔ اس طور میری جنگ کی آپ یعنی مرتب ہو جاتے گی۔ جنگ گزرنے کے بعد بشرط زندگی میں جان سکوں کا کہ جنگ کے دلوں میں کتنا سچوٹ سن اور کتنا سچوٹ کہا اور جنگ کی راتوں میں میں نے کتنا خوف کھایا، جس میں کتنی مرنبک پکپا پیدا ہوتی۔ میر سچوٹ اور میری بند دلی کا رسکار ڈیسے پاں محفوظ ہونا چاہیے۔

#### ۴۔ دسمبر

اہل وطن خوش میں، سب سے زیادہ وطن کے اخبار خوش میں۔ یکاک ان کی اشاعتیں دو گنی چو گتی ہو گئی ہیں۔ روز فتح کی ایک نئی خبر آتی ہے۔ روز لوگ اخباروں پر ٹوٹ کر گئتے ہیں اور فتح کی خبر پڑھ کر خوش ہوتے ہیں۔ مگر۔

فتح لندن کی ہوتی ہے قدم جمن کے پڑھتے ہیں

مگر کہ خیر آج فتح کے ساتھ مٹوس پیش قدمی کی بھی خبر ہے۔ امر تسری پر بھی قیضہ ہو گیا خواجہ صاحب نے اتنے وثوق سے اور اتنے معتبر راویوں کے حوالے سے یہ خبر سنائی کہ اب آج ان کو اعتبار کرنا پڑتا۔ مگر اب آج ان فتح اور تسلیت دونوں طرح کی خبریں منتاثت سے سنتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے خبر سنانے کے بعد میں نے خور سے انہیں دیکھا۔ اس میں چھرے پر ایک الٹیناں کی جھلک تو ہوتی۔

یہ گھر سے نکلا تو نذر اکی دکان سے لے کر شیراز تک یہ بخستنا چلا گیا کہ امترس پر قبضہ  
ہو گیا ہے۔

#### ۷۔ دسمبر:

اج کی تازہ بخبر، آگرہ کے ہوا تی اٹے کو تباہ و بر باد کر دیا گیا۔ یکسے یہ بلیک آور طے کے  
اندھیرے میں مرموں تاج چلگ جگ کر رہا تھا۔ اس سے آگرہ کا اور آگرہ کے ہوا تی اٹے  
کی جاتے وقوع کا پتہ چل گیا اور بیماری کی کے اسے تھس تھس کر دیا گیا۔

لوگ اس خیر کو بڑھ کر اور باخبر ذراائع سے رایطہ رکھنے والے یاروں سے اپنی تمام تفصیلات  
کے ساتھ سن کر لکھتے خوش ہوئے۔ اس بخركے ساتھ ہی تاج محل کی گمراہی ہوئی ساکھی کیا یک بجال  
ہو گئی وہ تمہم بیٹے کر پچکے تھے کہ تاج محل سے اور اس تاریخ سے جس نے تاج محل کو جنم دیا ہے  
پاکستان کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔

مرمر کی طرح سفید ایک عمارت اس شہر میں بھی ہے۔ اج جب ہم شیراز میں بیٹھے تھے۔  
تو عرفان نے اپنے طنز بھر سے لمحے میں کہا کہ بارہم نے اپنے بیل ہوٹل کو ڈھاکر جو ایک جھوٹا سپا  
تاج محل کھڑا کیا ہے وہ کہیں اپنے ساتھ ہمیں بھی نہ لے میٹھے۔“

”وہ یکسے؟“

”یار و فرس سے والپس آتے ہوتے میں اس راہ پر گرد را تو میں بہت ڈرا۔ وہ عمارت  
بلیک آور طے کے اندھیرے میں اتنی صاف نظر آہنی تھی جیسے یہاں ہلکی ہلکی روشنی کا انتظام ہو۔  
وہ من کے جماز اسے آسانی سے تماطل سکتے ہیں۔“

مجھے اس عمارت کے سفید ہونپی پر زمانہ من سے اعتمار ارض چلا آتا ہے۔ عمارت سفید ہوئے  
کے ساتھ تاج محل میں جلتے تو الگ ہات ہے ورنہ سفیدی عمارت کے باوقار بنیے میں بالعموم  
کھنڈت ڈالتی ہے۔ دھوپ، آندھی، بارش، چل کی بیٹ، یہ چار چیزوں مل کر کسی عمدت کو  
قدامت اور عنemat نہ خستی ہیں مگر یہ ہمارے شہر کی سفید عمارت اتنی نئی اور اتنی اعلیٰ ہے کہ